علمائے برصغیر اور مطالعۂ مسیحیت

مولانا محمد احسن بہاری - ۱

ضلع مونگیر (بہار) کی ایک مختصر سی بستی "محی الدین پور گیلانی" ہے جو اب صرف "گیلانی" کے نام سے معروف ہے۔ اس کی آبادی ۱۹۴۲ء میں پانچ چھ سو سے بمشکل زیادہ تھی[۱]۔ مسلمان آبادی میں بڑا حصہ واسطی زیدی سادات کا تھا [اور ہے] جن کے جدِ امجد سیّد احمد حاجنیری، خاندان میں سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی روایات کے مطابق سلطان شہاب الدین محمد غوری کے ساتھ برصغیر میں وارد ہوئے تھے۔ محمد غوری نے اُن کی جہادی خدمات سے خوش ہو کر اُنہیں کانپور کے نواح میں جاگیر عنایت کی۔ سیّد احمد حاجنیری نے اس جگہ کو اپنی سابق رہائش "محلہ حاجنیر" (بغداد) کی یاد میں وہی نام دیا جو وقت کے ساتھ "حاجنیر" سے مختصر ہو کر "حاج" رہ گیا۔ حاجنیر یا حاج میں سیّد احمد زیادہ عرصہ مقیم نہ رہے، وہاں سے مونگیر کے علاقے میں آ گئے، جہاں اُن کی اولاد در اولاد متعدد دیہات میں صدیوں سے آباد چلی آ رہی ہے۔

گیلانی کے سادات میں سے ایک بزرگ میر شجاعت علی تھے جو "انگریزی پولیس میں سرکل انسپکٹر کے عہدے پر ممتاز" ہونے کے باعث داروغہ شجاعت علی کہلاتے تھے۔ اُن کی بڑی خواہش تھی کہ اُن کی بچوں میں سے کوئی عالم دین ہو، مگر یہ آرزو اُن کی زندگی میں پوری نہ ہوئی۔ اُن کے بیٹے محمد احسن نے خوشحال خاندان کے ایک عام نوجوان کی طرح پرورش پائی۔ اُن کی شادی ہو گئی اور ایک لڑکا بھی ہو گیا تو اُنہیں تحصیلِ علم کا شوق ہوا۔ "بیوی، بچے، گھر بار سب کو ایک دفعہ سلام کر کے گیلانی سے روانہ ہوئے اور کامل چودہ سال کے بعد اُس وقت واپس ہوئے جب بیٹا جوان ہو چکا تھا[۲]۔"

تعلیم و تربیت

چودہ سال کا یہ عرصہ محمد احسن گیلانی نے علوم و معارف کی تحصیل میں ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک جگہ سے دوسری جگہ قیام و سفر میں گزارا، تاہم گھر سے خط و کتابت اور آنے جانے والوں کے ذریعے رابطہ قائم رہا۔ مظفر پور میں مولانا نعمت اللہ نبی نگری سے استفادہ کیا۔ علوم رسمیہ کی زیادہ تر کتابیں بنارس کے ایک عالم مولانا واجد علی بن ابراہیم سے پڑھیں۔ ریاضی اور ہیئت کی کتابیں مولانا نعمت اللہ فرنگی محلی (م ۱۸۷۳ء) سے پڑھیں۔ لکھنؤ کے قیام میں اُنہیں مولانا فضل حق خیر آبادی

(م۱۸۶۱ء) سے استفادے کا بھی موقع ملا جو اُن دنوں لکھنؤ میں صدر الصدور اور بعد ازاں نئی قائم ہونے والی کچہری "حضور نظام" کے مہتمم ہو گئے تھے۔ مولانا خیر آبادی سے علمی استفادے کا ذکر اُنھوں نے اپنی تحریروں میں کیا ہے[۳]۔ ۱۸۵۶ء میں لکھنؤ میں مقیم تھے۔ فلسفۂ الٰہیات کی ایک کتاب کی تصحیح سے فارغ ہونے پر حسبِ ذیل ترقیمہ لکھا[۴]۔

وقع الفراغ من تصحیح الکتاب فی بلدة لکھنو فی سنتہ ۱۲۷۲ شھر ذی قعدہ حین تسلطت النصاریٰ خذ لھم اللہ علی ھذہ البلدة و ذھب السلطان واجد علی شاہ للا ستغاثہ الی کلکتہ

[کتاب کی تصحیح سے لکھنؤ میں ذوقعدہ ۱۲۷۲ھ میں فراغت پائی جب نصاریٰ، خدا اُنھیں رسوا کرے، شہر پر قابض ہو چکے ہیں اور سلطان واجد علی شاہ استغاثہ کے لیے کلکتہ روانہ ہو گئے۔]

اس ترقیمہ کتاب سے لکھنے والے کا ذہن واضح ہے، وہ واجد علی شاہ کی ساری رنگ رلیوں کے باوجود اُسے "سلطان" سمجھتا ہے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط کو وہ "برطانوی" یا غیر ملکی تسلط کی جگہ دینی حوالے سے "تسلط نصاریٰ" خیال کرتا ہے۔

فنِ حدیث کی تحصیل اُنھوں نے مولانا اکبر علی رامپوری (م ۱۳۰۲ھ/۷۵ - ۱۷۷۴ء) اور مولانا سیّد عالم علی نگینوی (تلمیذ شاہ محمد اسحاق دہلوی) سے کی۔

تدریس

تحصیلِ علم سے فارغ ہونے کے بعد کچھ عرصہ "گیا" (بہار) کے سرکاری مدرسے میں فرائضِ تدریس انجام دیے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد "گیلانی" میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اُن کے پوتے مولانا مناظر احسن گیلانی کے الفاظ میں اُنھوں نے[۵]

> تقریباً تیس چالیس سال درس و تدریس کا بازار گرم رکھا، نہ صرف بہار بلکہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں حتیٰ کہ سرحد کابل تک کے طلبہ کی ایک اچھی خاصی تعداد مولانا سے پڑھنے کے لیے اِس گاؤں میں آئی۔ ہزارہ ضلع کے ایک بزرگ مولانا عبداللہ پنجابی وطناً، گیلانی نزیلاً تو پڑھنے کے لیے آئے اور اِس گاؤں میں متوطن ہو کر اپنے وعظ و تلقین، ارشاد و ہدایت، درس و تدریس، افتاء و تصنیف کا سلسلہ نصف صدی کے قریب برابر جاری رکھا، وہیں کی خاک میں آسودہ ہوئے اور ایک وہی کیا، بہار کے بعض جلیل القدر علماء مولانا رفیع الدین مرحوم رئیس شکرانواں، مولانا عبدالغفور رمضان پوری، مولانا حکیم عبدالسلام بھاگلپوری، مولانا حکیم دائم علی ٹونکی، مولانا اسماعیل رمضان پوری وغیرہ،

بیسویں مشاہیر گیلانی کی اِس درس گاہ سے اٹھے۔

وفات

درس و تدریس اور وعظ و نصیحت میں مصروف مولانا محمد احسن ۱۳۰۱ھ/۸۴-۱۸۸۳ء میں گیلانی میں فوت ہوئے اور وہیں دفنائے گئے۔

تصنیف و تالیف

مولانا محمد احسن گیلانی نے اپنے لائق اور نامور شاگردوں کے علاوہ کچھ کتابیں بھی یادگار چھوڑی تھیں۔ اِن میں سے حسب ذیل کے بارے میں اطلاعات ملتی ہیں۔

۱۔ حاشیہ "اقلیدس مقالہ اولیٰ" —— مدارسِ عربیہ کے نصاب میں شامل اقلیدس کے مقالہ اولیٰ کو تصحیح اشکال اور تحشیہ کے ساتھ مرتّب کیا جو لکھنؤ سے شائع ہوا۔

۲۔ حاشیہ علی حاشیہ بحر العلوم —— منطق میں "سُلم العلوم" ملّا محب اللہ بہاری کی درسی کتاب ہے۔ ملّا عبد العلی بحر العلوم فرنگی محلی (م ۱۸۱۰ء) نے اِس کی شرح لکھی، بعد ازاں اس شرح پر چند فوائد لکھے جو "التعلیقات علی شرح سُلم" کے نام سے معروف ہیں۔ ملّا عبد العلی بحر العلوم کی شرح و حاشیہ کئی بار شائع ہو چکے ہیں۔

مولانا محمد احسن گیلانی کا حاشیہ "التعلیقات علی شرح سُلم" پر ہے۔

۳۔ رسالہ در وجود رابطی و مشتاۃ بالتکرار (مطبوعہ)

۴۔ حل العقود (عربی) تصوّف کے موضوع پر رسالہ ہے۔

۵۔ مطالعہ مسیحیت پر ایک کتاب[۲]

جن دنوں مولانا محمد احسن بہاری بنارس میں بہ سلسلہ تعلیم مقیم تھے، اُنہیں اتفاقاً وہاں کے پادریوں سے ایک دن مباحثے کا اتفاق ہوا۔ مباحثے کے خاتمے پر اُنہیں ایک رسالہ دیا گیا۔ اُن کے الفاظ میں

> بالآخر اُنھوں نے ایک رسالہ جس کو کسی پادری نے --- بطلان رسالت خاتم النبیین شفیع المذنبین محمد مصطفیٰ ﷺ کی مرزا پور میں منطبع کیا ہے، اِس خاکسار کے حوالہ کر کے کہا کہ اِس کا جواب لکھو۔

مولانا بہاری نے رسالے کو اِس قابل نہ سمجھا کہ اِس کا جواب لکھیں، مگر اُن کے ذہن میں مسیحی منادوں کی اہم تبشیری کتابوں کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا اور اِن میں اسلام پر کیے گئے اعتراضات کا جائزہ لینے کا موقع ملا۔ اُنھوں نے پادری فانڈر کی تالیف "میزان الحق" اور پادری اسمٹ کی "تحقیقِ دینِ حق" کے مباحث پر گفتگو کی ہے۔

مولانا محمد احسن بہاری کی یہ تالیف زیورِ طباعت سے آراستہ نہ ہو سکی۔ اُن کے پوتے مولانا مناظر احسن گیلانی کے پاس موجود تھی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی کا ارادہ تھا کہ وہ کتاب کا نسخہ بخط مؤلف اُردو لائبریری دسنہ (بہار) میں محفوظ کرا دیں گے[۶]، کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنا سکے تھے یا نہیں۔ آج ہمارے پاس کوئی اطلاع نہیں ہے کہ یہ نسخہ اگر محفوظ ہے، تو کہاں ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی کے قلم سے اس کتاب کا بھرپور تعارف "جدید کلام —— قدیم زبان میں" کے زیرِ عنوان ماہنامہ "معارف" (اعظم گڑھ) میں جولائی اور اگست ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا تھا۔ ذیل میں ابتدائی تعارفی حصے کو حذف کرتے ہوئے مولانا مناظر احسن گیلانی کی تحریر پیش کی جاتی ہے۔

حواشی

۱۔ مناظر احسن گیلانی، پاک و ہند میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت، لاہور: مکتبہ رحمانیہ (س-ن)، جلد اوّل، ص ۳۵۲

۲۔ ایضاً، جلد دوم، ص ۲۹

۳۔ سیّد عبدالحی رائے بریلوی، نزہتہ الخواطر و بہجتہ المسامع والنواظر، کراچی: نور محمد اصح المطابع (۱۹۷۶ء)، جلد ۸، ص ۴۰۷

۴۔ مناظر احسن گیلانی، جدید کلام - قدیم زبان میں، ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ)، جولائی ۱۹۳۵، ص ۱۶

۵۔ مناظر احسن گیلانی، پاک و ہند میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت، حوالہ مذکورہ، جلد اوّل، ص ۳۵۳-۳۵۴

۶۔ حیرت ہے کہ مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنی تحریروں میں اس کتاب کا نام درج نہیں کیا۔

۷۔ ماہنامہ "معارف" (اعظم گڑھ)، اگست ۱۹۳۵ء، ص ۱۰۰ (حاشیہ)

سب سے پہلے مولانا مرحوم نے اس کتاب میں اس دعویٰ کو حل کیا ہے، کہ اسلام کے سوا چونکہ دنیا کے تمام مذاہب تاریخی ثبوت کھو چکے ہیں، اس لیے، "بدونِ تصدیق رسالت محمد مصطفیٰ ﷺ کوئی سبیل تصدیق انبیاء ماسبق کی نہیں۔"

لیکن آپ کے سامنے چونکہ اس وقت یورپ اور اُس کے مذاہب تھے، اس لیے آپ نے نہایت بسط و تفصیل سے پہلے یورپ کے دونوں مذاہب یعنی عیسائیت و یہودیت کی تاریخ لکھی ہے، ابتداء میں ان دونوں مذاہب کے دینی وثیقوں اور مستندات کی فہرست دی ہے، عربی، فارسی، انگریزی، عبری میں ان کتابوں کے جو نام ہیں، انہیں درج کر کے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں اندرونی و بیرونی شہادتوں سے ایک روشنی مہیا کی ہے کہ جس کے سامنے آنے کے بعد آج جن اساسوں پر ان مذاہب کی بنیاد قائم ہے، یکایک درہم برہم ہو جاتے ہیں۔ تورات کے متعلق بیرونی شہادتوں کے سلسلہ میں آپ نے یورپ کے بڑے بڑے علماء کے اقوال مع دلائل نقل کیے ہیں۔ خصوصاً اسمٹ، ٹیلر، رابرٹ وغیرہ کے کلام سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے، اسی طرح اندرونی شہادتوں کے ذیل میں خود تورات کی ایسی آیتیں پیش

کی ہیں، جن سے عیاناً یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جن انبیاء کی طرف یہ کتابیں منسوب کی جاتی ہیں، خود اُن کتابوں کی آیتیں گواہ ہیں کہ یہ انتساب قطعاً غلط ہے۔ آخر میں عہدِ عتیق کے مجموعہ کے متعلق آپ نے اپنا آخری فیصلہ ان عجیب وغریب تشبیہوں کے ساتھ درج کیا ہے۔

> اصل حقیقت یہ ہے کہ موسیٰ کی کتاب ایسی ہے، جیسے کوئی کسی تفسیر مثلاً تفسیر حسینی کا ترجمہ اردو کر ڈالے اس طرح کہ قرآن کی عبارت نہ لکھے، بلکہ صرف اس کا ترجمہ کر کے لکھے اور کتابیں (یعنی موسیٰ کی کتاب کے سوا) ایسی ہیں، جیسے ہمارے یہاں معارج النبوۃ، یا معراج نامہ یا مولد نامہ یا قیامت نامہ کہ جن میں قرآن اور احادیث کے الفاظ لے کر یہ کتابیں بنائی گئی ہیں، اور بعضے مثل حاتم طائی کی ہفت سیر اور شاہنامہ کے لکھی گئی ہیں۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ آپ نے اپنے اس فیصلہ میں اسلامی عدل کے قرآنی حکم اعدلوا ھواقرب للتقویٰ سے سرمو تجاوز نہیں فرمایا ہے۔ اس کے بعد آپ نے عہد جدید کی کتاب انجیل کو لیا ہے، اور ٹھیک اسی طرز سے اُس پر بحث کی ہے۔ عیسائیوں کے اس دعویٰ کی تغلیط کے لیے کہ لکھنے والوں نے اپنی اپنی انجیلیں روح القدس کی امداد سے لکھی ہیں، آپ نے چاروں انجیلوں کی متناقض عبارتوں کا ایک محاذاتی نقشہ پیش کیا ہے، جس کے دیکھنے کے بعد باسانی معلوم کیا جاسکتا ہے، کہ ان چار مختلف باتوں میں سے صرف ایک ہی بات صحیح ہوسکتی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جن کتابوں میں ایسی صریح غلطیاں ہوں، اُن کو روح القدس کی طرف منسوب کرنا خود عیسائیوں کی غلطی ہے، اور پھر آخر میں "عہدِ جدید" کے متعلق اپنا فیصلہ اس متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ان لفظوں میں پیش کرتے ہیں۔

> اصل حقیقت یہ ہے کہ تالیف اناجیل، مثل ملفوظات بزرگوں کے ہے، کہ جس میں اون کے نشست و برخاست کے قصے اور اُون کا نسب نامہ اور سلسلہ اور اون کی تقاریر مندرج ہوتے ہیں۔

فیصلہ کے آخر میں کیسے سچے تلے الفاظ میں اپنی اس رائے کو درج فرماتے ہیں۔

> مگر اس کے (یعنی انجیل کے) ضمن میں جو کلام عیسوی منقول ہے اگرچہ وہ بلفظہ عیسوی زبان میں نہیں، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بسبب یہودی نژاد ہونے کے عبری بولتے تھے، لیکن جائز ہے کہ وہ کلام الٰہی کا ترجمہ ہوئے۔

مجموعۂ بائبل کے متعلق اپنی اس رائے کے بعد آپ کی نظر اُن اختلافات کی طرف بھی گئی ہے، جو کہیں کہیں قرآن اور بائبل کے مضامین میں نظر آتے ہیں، آپ نے اس باب میں ایک عجیب مسلک پیش کیا ہے، فرماتے ہیں۔

> جس طرح کی تاویل بعضے انجیل کے جملوں کی اپنے اصولِ موضوعہ کی صحت کے لیے

عیسائی کرتے ہیں، اُس سے کم تاویل میں وہ جملے قرآن کے موافق ہوسکتے ہیں۔

نہ صرف یہودیوں، اور عیسائیوں، بلکہ دنیا کے وہ تمام مذاہب جن کی ابتداء تاریخ کے عہدِ تاریک میں ہوئی، اور سامانِ حفاظت کی کمی نے اُن کے دینی وثائق کو اپنے اصلی حال پر باقی نہ رہنے دیا، قرآن کے روشن اور تابناک تاریخی ثبوت کے نور میں اپنی تصحیح اس ٹھوس اور منصفانہ تجویز کی بنیاد پر کتنی آسانی سے کرسکتے ہیں، یقیناً مشکوک و مشتبہ مسودوں کی تصحیح کی یہی صورت ہوسکتی ہے، اور آج دنیا کے کس مذہب کو اس کی ضرورت نہیں؟ کتنے افسوس کی بات ہے، جس قرآن کا تعلق دنیا کے سارے مذاہب اور انبیاء سے صرف تصدیق و تصحیح کا تھا، نادانوں نے بلاوجہ اس سے تردیدی و تکذیبی تعلق پیدا کر کے ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔

یورپ کے مذاہب کے بنیادی اساسوں کی بحث سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے اسلام کے بنیادی وثیقوں کو پیش فرمایا ہے، لیکن جیسا کہ سرولیم میور نے لکھا ہے کہ قرآن کا تاریخی طور پر محمد ﷺ کی طرف منسوب ہونا ہم عیسائیوں کے نزدیک بھی اسی قدر قطعی ہے، جس طرح مسلمان اس کو خدا کا کلام قطعی طور پر سمجھتے ہیں، اس لیے قرآن کے تاریخی پہلو پر بحث کرنے کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے، صرف اُس کے مضامین کی اندرونی شہادتوں پر آپ نے قناعت کی ہے، قرآنی مضامین کی افادی حیثیت کے متعلق لکھتے ہیں، اور کس قدر جامعیّت سے کل بیس نمبروں میں تیس پاروں کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

> کوئی رکوع بلکہ کوئی پنج آیت بلکہ کوئی آیتِ متوسطہ خالی نہیں ہے، جس میں امور مفصلۂ ذیل سے کوئی نہ کوئی بات ہو۔
>
> (۱) حضرت مبدء جلّ شانہ کی صفات کاملہ کا بیان (۲) ترغیب ذکر الہیٰ (۳) نصیحت تقوی الہیٰ (۴) تاکید رجوع الی اللہ در ہر امر (۵) نصیحت تہذیب اخلاق مجملاً (۶) ستایش اخلاق مثل حلم و تواضع و عفت و کرم و سخاوت و شجاعت و عفو و سماحت (۷) نکوہش اخلاقِ رذیلہ مثل تہور و جبن، وقاحت و بخل، کبر و ظلم و اتلاف (۸) ترغیب بہ توکل وزہد و قناعت و اخلاص و حریت (۹) تہدید از ریاء و سمعہ و عجب، و تملق و چاپلوسی و حرص، و حب دنیا (۱۰) ترغیب محبت مع اللہ و اہل اللہ (۱۱) تہدید از صحبت بے ادباں و ارباب جہل مرکب (۱۲) مسائل تدبیر منزل (۱۳) سیاست مدنیہ (۱۴) ذکر خیر حضرات انبیاء علیہم السلام (۱۵) نکوہش دشمنانِ آنہا (۱۶) حکم بایمان آوردن، بعیسیٰ و موسیٰ و غیرہما انبیاء بنی اسرائیل و ابرہیم و نوح و غیرہما، از انبیاء پیشین خصوصاً و عموماً علیٰ نبینا علیہ السلام (۱۷) سخنانِ معرفت و حقیقت کہ موثر قوی برائے وصل الی اللہ باشد (۱۸) ذکر معاد انسانی ولذت و الم جاودانی، از برزخ تا جنت و نار (۱۹) ذکر بے ثباتی ارکان عالم (۲۰) دعوت بہ توحید الہیٰ۔

ان مضامین پر قرآن کا مشتمل ہونا، اور پھر فصاحت و بلاغت کے انتہائی معیار پر اُس کی ہر آیت کا کھرا ہو کر نکلنا۔ اس کے متعلق فرماتے ہیں۔

> ظاہر ہے کہ بیان خط و خال، قد و بالا، ناز و ادا، شادی و غم، ہجر و وصل، شراب و کباب، بزم و رزم، باغ و صحرا وغیرہ مضامین جن میں فصاحت و بلاغت اور صنائع و بدائع، معانی بیان کی گنجائش بہت ہوا کرتی ہے، نہ کہ اس میں جس میں مبداء اور معاد کے صفات اور حالات اور قوانین عبادات و معاملات، تمدّن و سیاسیات، سراپا حکومت کی باتوں میں ہے، اور مھذا معانی و بیان کے قواعد و محسنات بدیعہ کے لطائف باحسن وجوہ اس میں مرعی ہیں۔

آپ نے اس کو محدود قوت والے انسان کی پرواز سے بالاتر ٹھہرا کر صرف غیر محدود کلامی قوت کا مظاہرہ قرار دیا ہے، اور یہی آپ کے نزدیک اعجاز قرآنی کی اندرونی اور ہمیشہ باقی رہنے والی ابدی شہادت ہے۔ جب تک دنیا میں قرآن موجود ہے، اس اعجازی وجہ کو اُس سے کوئی جدا نہیں کر سکتا، قرآن کے ساتھ آپ نے اسلام کے دوسرے سرچشمہ یعنی حدیث پر بھی بحث کی ہے۔ یہ بحث ذرا طویل ہے، لیکن جستہ جستہ مقامات سے اس کی بعض چیزیں یہاں درج کی جاتی ہیں، فرماتے ہیں۔

> ہمارے یہاں ایک عظیم الشان فن مقرر ہوا ہے، اور اس فن کے بیسیوں، بلکہ سینکڑوں دانا لوگ ایسے گزرے ہیں کہ اُن کی وثاقت، اور اُن کی اس فن میں مہارت جتنے اہلِ علم ہیں، سب جانتے ہیں، اور جان سکتے ہیں۔

اور آگے چل کر فرماتے ہیں۔

> اس فن میں یہ بحث ہے کہ فلانی بات جو فلانے شخص کی طرف منسوب ہے، اُس کے ناقل نے بلاواسطہ سن کر لکھا ہے یا بالواسطہ۔ اور اگر بلاواسطہ ہے، تو وہ ناقل کون شخص ہے، کہاں رہتا تھا، کب پیدا ہوا، کب مر گیا، فضول گو تھا یا راست گو تھا، مغلوب النسیان تھا یا حافظہ والا، صاحبِ تفتیش تھا یا سفاہت والا، اور اپنے بیان میں مضطرب تھا یا مستقل، اور اس کے مذہب میں تمیز بین الحق والباطل کی جگہ تلبیس بین الحق والباطل جائز تھا یا ممتنع۔

اہلِ علم اندازہ کر سکتے ہیں، کہ رواۃ حدیث کے صفات کو اردو زبان میں مصنّف نے کس قدر منقح شستہ پیرایہ میں ادا کیا ہے، پھر حدیث کی مختلف قسموں، متواتر، مشہور، آحاد کی تعریف اور علمی نتائج کے درج کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

> اور اگر ہر طبقہ میں اس کے متعدد ثقہ راوی نہیں تو دیکھا جاتا ہے کہ آیا بداہت عقل کے خلاف کوئی بات اس میں ہے یا نہیں، اگر بداہت عقل کے خلاف ہے، تو وہ بھی

کان لم یکن متصوّر ہوتی ہے، یعنی اُسے یہ سمجھتے ہیں، کہ کسی نے سہو سے یہ بات بڑھا دی یا گھٹا دی، یا اُس کی تاویل عرف کے موافق کچھ کی جاتی ہے، جیسے عیسائی لوگ تورات کی اِس روایت کی کہ سرزمین کنعان میں دودھ اور شہد کی ندیاں بہتی ہیں، کرتے ہیں۔

حدیث کے اِن ظنی حصّوں کے متعلق یہ لکھ کر کہ علاوہ بداہتہ عقل کے اگر قرآن یا متواتر خبروں کے بھی وہ مخالف ہو، تو فنی طور پر محدثین اس کو بھی رد کر دیتے ہیں، آپ لکھتے ہیں۔

اور اگر ان دو قباحتوں میں سے کوئی قباحت اس (حدیث) میں نہ ہوئے، تو دیکھا جائے کہ آیا تفصیل ہے، انھیں قطعیات کی تو اوس کی بھی تصدیق کرتے ہیں، جیسے سخاوت اور صبر، تحمل و زہد، توکّل کے فضائل وغیرہ اور اگر اِن قطعیات کی تفصیل نہیں ہے، بلکہ ایک الگ بات ہے، تو اگر سب راوی اس کے ثقہ ہیں، اور بیچ میں کہیں سے سلسلہ منقطع نہیں ہوا ہے، اور اوس کے معارض کوئی ایسی روایت نہیں ہے، سو اگر عملیات میں ہے، تو بظنِ غالب واجب العمل ہوتی ہے، جیسے اکثر مسائل نماز، روزہ، بیع و رہن وغیرہ کے اور منجملہ اعتقادات کے ہیں، تو بظن غالب اِس کا ماننا بھی ہوتا ہے، نہ بر سبیل جزم و یقین۔

اگر خود اِس قسم کی حدیثیں باہم ایک دوسرے کی ضد ہوں، تو اِس کے متعلق آپ نے اِس عجیب مسلک کو پیش کیا ہے۔

اور اگر ایسی روایتیں ہمدگر مختلف ہوتی ہیں، سو اگر منجملہ عملیات ہے، تو احد الروایتین پر عمل کرنے کے لیے ترجیح ظنی دیکھا جایا کرتی ہے، اور اگر یہ حاصل ہو تو فبہا، ورنہ جس پر چاہا عمل کیا اور اگر منجملہ نظریات ہے تو کسی جانب عقیدہ نہیں باندھا جاتا۔

آج معمولی فروعی مسائل مثلاً آمین، رفع الیدین، قرأۃ فاتحہ وغیرہ کے متعلق ان ہی اختلافی ظنی حدیثوں کی بنیاد پر [برصغیر] میں جدلیات و نزاعات کا ایک سلسلہ چھڑ گیا ہے، اردو زبان کے ایک قدیم مصنّف نے کتنی آسانی کے ساتھ اُسے کس طرح طے کر دیا ہے، فجزاہ اللہ عنا خیر الجزاء

حدیث کی ان تاریخی استواریوں، اعتماد کی عقلی بنیادوں کے استحکامات کو دکھانے کے بعد آپ نے یورپ کو چیلنج دیا ہے، کہ قرآن تو خیر، حدیث ہی کے مقابلہ میں تم اپنی اساسی کتابوں کے کسی ایک فقرہ کے متعلق اس قسم کا کوئی ثبوت بہم پہنچا سکتے ہو، فرماتے ہیں۔

تورات کی سندیں انبیاء منسوب علیہم سے بطلیموس کے وقت تک اور انجیل کی حضرت عیسیٰ سے قسطنطین تک کے لکھ دیجیے۔

آخر میں لکھتے ہیں اور کس قدر سچ لکھتے ہیں، دنیا کے تمام مذاہب کو اِس سے عبرت پذیر ہونا چاہیے، "اور فقط یہ کہنا کہ یہ کتاب الہام سے لکھی گئی ہے، اِس واسطے واجب التسلیم جاننا چاہیے، تو

مؤلف حاتم کی ہفت سیر اور داستانِ امیر حمزہ کا بھی یہی کہہ سکتا ہے۔"

اسلام اور اس کے مسائل و قوانین کی اِن دونوں بنیادی یادداشتوں پر بحث کرنے کے بعد ضرورت نہیں رہتی، کہ قرآن وحدیث کی طے شدہ شکلیں جن کا نام فقہ و تصوف ہے، مؤلف علام بحث کرتے، لیکن مسیحی علم کلام کے متعلق ڈاکٹر ٹیلر کی اس رائے کو درج کرنے کے بعد،

> کہ ابتداء میں ان قابل شخصوں (یعنی مسیحی متکلمین) کے سبب سے بھی جنھوں نے قصد کیا احکام دینِ مسیح کو گبروں کے حکماء کی حکمت سے تطبیق دیں، مسیحی کلیسا نے بہت ضرر اُٹھایا۔

مولانا مرحوم نے مسلمانوں کے علمِ کلام کو بھی اسلام کے لیے ایک بلا قرار دیا ہے، فرماتے ہیں۔

بعضے علماء اسلام بھی اِس بلا میں بمقتضائے لتبعن سنن اللذین من قبلکم میں پڑے۔

(جاری ہے)